عشق کی انوکھی کتھائیں جو یقیناً آپ کے ذہنوں پر نقش ہو جائیں گی
عشق نمبر کی 6 دل نشیں، نقش آفریں کہانیاں

# بے غیرت کہیں کی

ایڈیسن ادریس مسیح

اُس لاج کی ماری سہاگن کی کتھا، جس نے اپنے ساجن کا جوگ لے لیا تھا

مجھے لاجو دیدی بہت پسند تھیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں لاجو دیدی سے زیادہ ڈھیٹ عورت کبھی نہیں دیکھی۔ عجیب عورت تھی بالکل مٹی کا مدھو..... ساس پوپلا منہ بھر بھر کر گالیاں بکا کرتی، نندیں الگ بے عزتی کرتی رہتیں، شوہر کے تو جوتے ہی اس کے سر پر ٹوٹتے تھے مگر مجال ہے، اف بھی کر جائیں۔ جب دیکھو، سر جھکائے کبھی لمبا جھاڑو پکڑے دہلیز دھو رہی ہیں، کبھی چھت پر کپڑے دھو دھو پھیلا تیں، ابھی لال مرچیں سکھا رہی ہیں، ابھی چاول چن رہی ہیں، دال گھوٹ رہی ہیں۔ میں جب بھی گزرا کرتا، چوپٹ کھلے دروازے سے کچھ نہ کچھ کرتی ہی نظر آتیں۔ ایک کمرے کا تو گھر تھا جس کے سرخ فرش کو گئے، کتھے کی گلکاریاں مزید رنگ گئی تھیں کونوں پر سے۔

لاجونتی دیدی سے مجھے کوئی خاص ہمدردی تھی۔ تائی اماں کہتی ہیں کہ میں نے ان کے بچوں کو بدتمیزی سکھائی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں دیدی کو بھی تھوڑی سی بدتمیزی، کم از کم غلیل سے کنکر مارنا تو سکھا ہی دوں تا کہ جب بھی اُس کی کالی بھینس جیسی ساس گلی میں کھڑی سبزی خریدے تو وہ دروازے کے پیچھے چھپ کر اس کے موٹے ننگے پیٹ پر ایک روڑا ہی کھینچ ماریں، پیٹ کا مٹکہ پھوٹے، تھوڑی دبلی ہوں تو ذرا ہل کر پانی وانی ہی پی لیا کریں۔ ہم دن بھر سنتے، لاجو دیدی کو پکار پڑتی رہتی تھی یا پھر لعنت پھٹکار.....

میری اماں کہا کرتی تھیں۔ وہ لوگ ہندو ہیں، ان کے یہاں نہیں جایا کرتے۔ وہ چھوٹے بچوں کو کاٹ کر بھگوان کو بلی چڑھاتے ہیں۔ شروع شروع میں، میں ڈر گیا تھا، جھٹ میرے ذہن میں کالے پتھر کی بنی مورتی در آتی جس کی لمبی زبان سے خون ٹپک رہا ہوتا اور آنکھیں وحشت سے ابلی پڑتیں۔ رفتہ رفتہ یہ تصور بھی زائل ہوتا گیا اور میں نے اماں کی بات کو اہمیت دینا چھوڑ دیا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے بھلا اور اگر ایسا ہوتا تو بھلا حیدر چاچو روز اوپر منڈیر پر بازو رکھے لاجو دیدی کی سب سے چھوٹی نند سرلا سے کیوں باتیں کرتے رہتے اور میں بیسنی روٹی کھاتے چھت کی سیڑھیوں پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی چوکیداری کے بدلے میں مجھے بھی ایک روٹی اور کبھی پاپڑ ملا کرتے تھے۔

لاجو دیدی بیسنی روٹیاں اور پاپڑ بنایا کرتی تھیں۔

ہفتے میں دو مرتبہ سائیکل پر ایک کانے انکل آیا کرتے تھے اور یہ مال تھیلیاں بھر بھر لے جایا کرتے۔ اس دن لاجو دیدی کے گھر سے کھانے کی اشتہا بھری خوشبو آیا کرتی تھی۔ اس دن ان کے گھر سے لاجو دیدی کو پکارتی غصے بھری آوازیں بھی ذرا کم ہی آتیں۔

لاجو دیدی کا لمبا سا قد تھا' مردوں جیسا وہ اکثر گلابی رنگ کی کاٹن کی ساڑی باندھا کرتیں اور کانوں میں موتیے کی کلیاں' اُن کی سانولی رنگت پر سرمئی آنکھیں عجیب غم انگیز سا تاثر دیتی تھیں لیکن جس دن ذرا وہ کاجل' سرمہ لگا کر دنداسہ ملتیں تو یہی آنکھیں لو دینے لگتیں' گمان گزرتا' لاجو دیدی کی کوئی بہن آ ٹھہری ہیں ان کے ہاں' ان کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی' میٹھی میٹھی کوملتا کا سندر احساس لیے۔ صبح صبح جب وہ چھوٹی گھنٹی ہلا ہلا کر بھجن پڑھا کرتیں تو میں کبھی شرٹ کے بٹن بند کرنا بھول جاتا' کبھی بوٹ کے تسمے بند کرنا۔ امی کو سخت چڑ تھی لاجو دیدی سے اور اس کے بھجن سے..... جب تک وہ گاتیں' یہ بکتی جھکتی رہتیں۔

اُن کے اور ہمارے گھر کی ایک ہی دیوار تھی' چھوٹے چھوٹے گھر تھے' کوشش کر کے بھی اِدھر کی باتیں اُدھر چھپی نہ رہ سکتیں۔ ہمیں سب پتا چلتا رہتا تھا۔ لاجو دیدی کی شیکھر سے سگائی کو نواں برس تھا مگر اب تک گود خالی تھی۔ گھر والے ہر طرح کا دوادارو کر کے اب تھک ہارے تھے مگر شیکھر بہت برداشت والا تھا ور نکاس کی ماں تو لاکھ سر پیٹی کہ..... ''نکال باہر کرے اس چھمنی کو' تینوں ٹائم کھا کے بس پڑی رہے ہے۔ نحوست کی ماری' جو بچہ نہ پیدا کر پائے' وہ بھلا عورت کس کام کی.....''

یہ تمام باتیں سن کر لاجو دیدی خاموش ہی رہتیں' چپ چاپ سب سنتیں۔ مجھے بڑا غصہ آتا..... حد ہوتی ہے' میرا دوست کہتا تھا' گالی کھا کر بے غیرت لوگ چپ رہتے ہیں۔ غیرت مند آدمی بولتا ہے۔ مجھے جب ماجد کے بھائی نے گالی دی تھی تو میں نے بجھی تو بڑا سا پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا..... اور ایک یہ ہیں' بہری کہیں کی' سنتی ہی رہتی ہیں۔ واقعی بے غیرت ہیں..... میں نے اپنی زندگی میں لاجو دیدی سے زیادہ بے غیرت عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

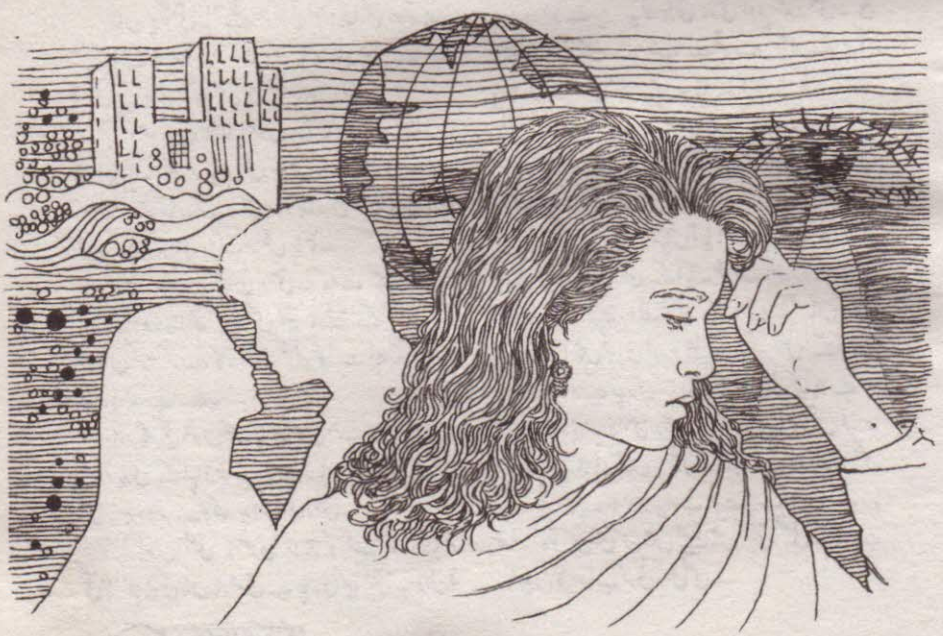

لاجو دیدی کو شیکھر انکل سے عشق تھا، بچپن میں ہی ان کی بات پکی ہوگئی تھی مگر جوان ہو کر شیکھر انکل کے خیالات بدل گئے تھے، وہ سگائی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے...... ہائیں...... جس نے سنا، ٹھٹھول میں اڑا دیا۔ ''ایسی بھی کیا لجا کہ تم بیاہ سے انکاری ہو بیٹھے ہو؟ آج کل تو لونڈے ہاتھ بڑھا منہ سے بر مانگ لیا کرتے ہیں۔'' بات آئی گئی ہو جاتی، سمے کچھ اور سرک جاتا، ہر چار، چھ مہینے بعد شیکھر انکل کی میا کو بارات سجانے کا بخار چڑھتا۔ شام کی چائے میں اسے لیے بیٹھتیں، خوشامدیں کرتیں، منصوبے بناتیں۔ لاجو دیدی کے حسنِ بے مثال خصوصاً بڑی آنکھوں کے وہ وہ قصیدے پڑھتیں کہ شیکھر تلملا کر رہ جاتا۔

''تو اماں......! میں کیا کروں، اس کی آنکھ اگر یہ بڑی بڑی ہے تو کون سا مجھے اس کی آنکھ سے دیکھنا ہے؟''

''تُو بس ہاں کر دے، آنگن چمک جاوے گا میرا، جیتے جی بہو کا ارمان پورا ہو جاوے تو چار دن بچے کھلا لوں تیرے اور بھلا کیا ہوں گے مجھ بڑھیا کے ارمان......'' شیکھر کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

اماں پوچھتی۔ ''تجھے جو کوئی اور بھا گئی ہو تو بھاڑ میں جائے لاجونتی...... بتا مجھے، ہاتھ پیر جوڑ کے لے آؤں گی، تیری خوشی میں ہی خوش ہوں بیٹا......!''

شیکھر چپ بیٹھا ہاتھوں پر آتا پسینہ پونچھتا رہتا پھر اچانک اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ رات دوسرے پہر آتا، بنا کچھ کھائے پیے ہی سو رہتا۔ صبح منہ اندھیرے ہی چائے کی پیالی سڑک کر نکل پڑتا۔

پیچھے اماں پریشان رہتی۔ ''رات میں بھی بنا کھائے سو رہتا تھا، صبح بھی بغیر ناشتے کے گیا۔ اچھا، بھگوان کرم کرے گا۔ آج شلغم گوشت پکا لیتی ہوں، بہت پسند ہے اسے۔''

اور پھر کئی دنوں تک بات یوں دب جاتی مگر ادھر لاجو دیدی کے کمپاؤنڈ میں بات زیادہ دن دبی نہ رہتی تھی۔ ہر دوسرے کو کھد بد لگی ہی رہتی۔

''کیوں بھئی مادھوی، لاجو کو کب تک بیاہو گی؟'' لاجو کی ماں مادھوی بے چاری کیا کہتی، یہ سوال تو خود اس کو اندر ہی اندر ڈستا رہتا تھا۔ لاجونتی سولہویں سے نکلی تھی، لمبا سرو قد، چڑھتی جوانی، سلونی رنگت، کئی آہیں بھرتے تھے تو کئی نیم بسمل تھے، پر لاجو تو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی کجا کہ کسی ایرے غیرے کے نام کی نتھ پہنے۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب سے ہی سنتی آئی تھی کہ شیکھر اس کے بابو جی کے دوست کا بیٹا ہے۔ وہ اسی سے بیاہی جائے گی۔ پہلے پہل بھلا کیا اہمیت دیتی، پر ایک مرتبہ جب وہ سب بچپن میں دیوالی پر آئے تھے، لاجو نکڑ پہ ٹھیلے پر کھڑی میٹھے لچھے کھا رہی تھی۔ شیکھر بھی آن کھڑا ہوا تھا۔ کتھئی شلوار سوٹ میں کالی رنگت پر سامنے کا ٹوٹا دانت...... لاجو جو ہنسی تو ہنستی ہی چلی گئی اور پھر ہنستے ہنستے ہی بولی۔ ''بندر...... کالا بندر......''

شیکھر سے بھی جو بن پڑا، کہا اور پیچھے دوڑا پر لاجو کہاں ہاتھ میں آنی تھی، آگے پیچھے دوڑتے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو سامنے بچھی چار پائیوں کی قطار پر نئی چادریں بچھی تھیں اور حقے کی کسیلی مہک میں تازہ گڑ کی باس بھی شامل تھی۔ لاجو ٹھٹھک کر رک گئی۔

''یہ ہے اپنی لاجو......'' بابو جی نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''ارے...... یہ تو بڑی ہوگئی اور سندر بھی۔ سچ کہوں بھیا، میں نے جب سے تم سے شیکھر کے بر کی بات کی تھی تو کیا معلوم تھا، یہ چوہیا سی ایسا رنگ نکالے گی بھئی، بہت کرپا ہے بھگوان کی۔'' یہ بات سن کر لاجو شرما سی گئی اور جلدی سے نمستے جھاڑ کر اندر اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلی تھی۔

''پگلی...... تیرا سسرال آیا بیٹھا ہے۔ کیا کد کڑے بھرتی ہے۔ چپکی بن کے ایک طرف بیٹھ رہ۔ لے یہ دھنیے کے پتے الگ کر کے دے۔'' ماں نے سرگوشیوں میں خبر لی اور دھنیے کی چنگیر اس کے آگے کر دی۔ وہ بے چاری کیا جانتی کہ سسرال کیا بلا ہے، سو بس سر نیہوڑائے جتی رہی۔ ذرا دیر میں عورتیں اسے اپنے پاس بلاتی تھیں، باتیں کرتیں، کوئی روپیہ ٹکا بھی رکھ دیتی تلی پر۔ لاجو کو یہ سب بہت عجیب اور نیا لگ رہا تھا۔ وہ تو من ہی من میں پسینے میں بھیگتی ہتھیلی میں دبے روپیوں کا حساب کرتی رہی تھی۔

رات کو جب مہمان رخصت ہوئے تو ماں نے سب روپیوں کا حساب مانگ لیا۔ لاجو جانتی تھی' اس نے بھی پورے پانچ روپے اپنے اندر الگ سے چھپا رکھے تھے۔ لاجو نے سوا دو روپے ماں کی ہتھیلی پر رکھے تو ان کا منہ لٹک گیا۔

''ہوں..... اونچی دکان' پھیکا پکوان۔ مکھی چوس کہیں کے۔ چل بٹیا.....! یہ تو ہی رکھ لے۔'' لاجو دیدی کی تو جیسے لاٹری ہی نکل آئی تھی۔ ''اور سن' تو نے شیکھر کو بندر کیوں بولا بھلا؟''

''بندر ہی تو لگتا تھا ماں.....!'' مزے سے چاول کھاتے کھاتے پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''اوں ہوں..... ایسا نہیں بولتے۔ تیرا بیاہ ہوگا اس سے۔ تیرے بابو جی نے بات کر رکھی ہے۔''

''ہائے ماں.....! اس سے کیوں؟ میں نہ کروں اس سے بیاہ ویاہ۔''

اماں ہنستے ہنستے دہری ہوگئی تھیں۔ ''او بے شرم' اپنے منہ اپنے بیاہ کی بات نہیں کرتے۔''

☆.....☆

وقت نے پھیرے لیے تو لاجو اب جوان کھڑی تھی۔ ماں کے کہے کے مطابق' اب وہ اپنے بیاہ کی بات کبھی نہیں کرتی تھی مگر باقی سب کرتے تھے۔ اپنے ساتھ شیکھر کا نام سن سن کر اسے اب عادت ہو چکی تھی اس نام کی۔ اس نے خیالوں میں ہی اس کو اپنا پتی پرمیشور مان لیا تھا۔ تین چار بار اسے دیکھا بھی تھا۔ ایک مرتبہ چاندنی ماسی کی بارات پر پھر ایک دفعہ بڑی پوجا ٹھہری تھی کمپاؤنڈ میں اور ایک دفعہ کلفٹن کے مندر میں اور لاتعداد مرتبہ سیاہ رات میں اپنے خوابوں کے چمکتے جزیروں میں' خوب قد کاٹھ نکالا تھا اس کالے بندر نے۔ وہ رانوں پر پھنسی پھنسی جینز اور بازوؤں پر تنگ پڑتی ٹی شرٹ پہنتا تھا۔ بال گردن تک بڑھا رکھے تھے اور داڑھی مونچھ ندارد..... دائیں کان میں چھوٹی سی مندری تھی۔ لاجو دیدی تو اب شیکھر جی پر قربان ہوگئی تھیں۔

☆.....☆

ہولی' دیوالی پر لاجو کے لیے سسرال سے بڑے اچھے اچھے جوڑے آیا کرتے تھے۔ سکھیاں بالیاں رشک کرتیں مگر بیاہ کا معاملہ تو مسلسل کھٹائی میں تھا۔ واہ' واہ' کرتی زبانیں اب ہاہا کرنے لگ گئی تھیں تو لاجو کی ماں خود ہی بیٹی کے سسرال جا پہنچی تھی۔

''لاجو ہم پر کوئی بوجھ تو نہیں' پر تم بھی جانو ہو' جدھر کا انگ ہو' اُدھر ہو سجے ہے۔ سارا کمپونڈ باتیں کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو کہو' ہم آپس میں کر گزریں گے۔''

''ناہیں بہن.....! مسئلہ کیا ہوگا' تم فکر ہی نہ کرو' ہم دیکھتے ہیں' جلدی ہی کچھ خبر دیں گے' تم تیاری رکھو۔''

''لاجو کے پتا جی بھی گھلے جاتے ہیں' بیماری نے مانو جڑ پکڑ لی ہے ان میں۔ سانس کا کیا بھروسہ کب نہ آئے' اپنی جندگی میں بٹیا کے ہاتھ پیلے کر دیں تو سکھ شانتی رہے گی ذرا۔''

اب شیکھر کی ماں نے رٹ پکڑ لی مگر شیکھر..... پھر لاجو دیدی کے پتا جی بس یونہی اچانک بہت خاموشی سے مر گئے۔ پھر کوئی سات آٹھ ماہ بعد شیکھر کے پتا جی دبئی سے آئے تو اس کی ایک نہ چلی' بہت سادگی سے بیاہ ہوگیا۔ شروع میں تو چاؤ چونچلے ہوتے ہی ہیں مگر شیکھر کی ماں نے تو حد ہی کر دی تھی' لاجو کو بالکل ہتھیلی کا چھالا بنا لیا تھا' کھانا پانی تک مسہری تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

چھٹے مہینے میں پہلی بار یہ پوچھا گیا۔ ''گود کب ہری ہو رہی ہے؟'' بے چاری کیا جواب دیتی' آٹھویں مہینے میں ٹونے ٹپانے شروع۔ لاجو دیدی آدھی رہ جاتیں جب ساس ہر کسی کے آگے بے اولادی کا رونا روتیں مگر کبھی پلٹ کر کچھ نہ کہا' بس چپ چاپ پتیلیاں مانجھتی رہتیں۔

☆.....☆

شیکھر کسی پرائیویٹ فیکٹری میں صفائی کا کام کرتا تھا مگر گھر آتے ہی خود بابو بن جاتا' ٹانگیں پسار کے لمبے صوفے پر پڑ رہتا اور ٹی وی پر گھٹیا درجے کی فلمیں دیکھتا رہتا۔ ماں اس عرصے میں آس پاس ہی رہتی۔

''شیکھر..... کیا بات ہوئی بیٹا؟ میں حسرت ہی

نہ لے جاؤں تیرا منا کھلانے کی؟ ذرا غور تو کیا ہوتا' اب بھی کچھ نہیں گیا۔ تو کہے تو.....''

''اماں.....! کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' جب میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں' میرے پاس نہیں آیا کر۔ پہلے ایک ہی رٹ تھی تیری' شادی کرلے' اب شادی کرتو لی اور کیا کروں؟''

شیکھر کے لیے یہ کیا کم غضب کی بات تھی کہ فلم کے دوران ماں کی موجودگی میں اسے بار بار چینل بدلنا پڑتا تھا۔ وہ وہیں نیم دراز کھانا کھاتا۔ آج کل کھانے میں کبھی نمک بہت ہوتا تھا' کبھی ہلدی۔ لاجو دیدی بے چاری لاتیں کھاتی اور پھر رات جب تلک جاگتی' مٹھیاں بھرتی رہتی۔ وہ دنوں میں ہی مرگھٹ کی بھتنی لگنے لگی تھی۔ نامراد..... گال پچک گئے تھے' آنکھیں گہرے کھڈوں میں جا سمائی تھیں اور سانولے ہاتھوں پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں مگر مجال کہ دورے کی دوا بھی لی ہو کبھی۔ سردی گرمی بس وکس بام ملا کرتی تھیں ماتھے پر' اوپر سے سوتی کپڑا لپیٹ کر چل سو چل کا نام..... صبح سے رات' رات سے صبح کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ایسی بیماری اور کام کے عالم میں اُن کا مانگہ آدھمکا مگر وہ اُن سے سب کچھ چھپا گئیں اور ایسا سوانگ بھرا کہ کہنا ہی کیا۔ پر ماں تو ماں ہی تھی ناں' جاتے سمے تک ہاتھ پکڑ پکڑ پوچھتی رہی۔

''تو خوش ہے ناں لاجو؟ مجھ سے کوئی بھول تو نہیں ہوئی ناں؟'' وہ ناں ناں کرتی رہی اور چولہا چکی بھی۔ ماں بس دیدے بھر بھر دیکھتی تھی' لاجو دیدی کا خیال تھا کہ اس طرح بات بگڑے گی' بس اگلے روز سے کانوں میں موتیا پرونے لگیں اور دنداسہ منگا رکھا اکٹھا ہی بھر بھر سرمہ سلائیاں لگایا کرتیں اور آئے گئے سے خوب ٹھٹھول کرتیں مگر کب تک' اندر دیمک لگتی ہے تو کھوکھلا پن باہر جھلکتا ہی ہے۔

اولاد نہ ہونے پر ساس نندوں نے سر پیٹ لیا تھا مگر لاجو دیدی کہاں ٹس سے مس ہوئیں ڈاکٹر کے جانے پر' بس یہی کہتیں۔

''بھگوان چاہیں گے تو آپ ہی کرم ہوگا۔'' کیسی بھی دلیل دے لو' کتنا بھی گلا سکھا لو' چاہے جواب میں اطمینان سے پر لہجے میں یہی الفاظ سننے کو ملتے اور جلتی پہ تیل کا کام ہو جاتا۔

''آئے ہائے' بھگوان جنے' کیا چاہے ہیں؟ تجھ کم ذات کو باندھ دیا ہمارے کلے..... نہ اگلنے کے رہے نہ نگلنے کے۔ کیا معلوم کیا ٹونہ کروا رکھا ہے جو شیکھر بابو بھی بس کاٹھ کا الو بنے بیٹھے ہیں؟ ایسا بھی کال تو نا ہیں پڑا میرے رام لکھن کے لیے' آج بھی برادری میں بات نکلنے کی دیری ہے بس۔''

اسی کھینچا تانی میں ایک نہ دو' پورے نو برس گزر چکے تھے۔ اب تو ساس بھی ہمت ہار بیٹھی تھی۔ شیکھر بابو پہلے سے کہیں زیادہ چڑچڑے ہو گئے تھے' برتن اٹھا اٹھا پھینکنے لگے تھے' ساس بھی لاجو دیدی کا پکا نہیں کھاتی تھیں' نندیں سب بیاہی گئیں۔ حیدر چاچو بھی ایک بچے کے باپ بن گئے تھے۔ میں اکثر تنگ کرتا۔ ''بتاؤں چاچی کو لاجو دیدی کی نند والی بات؟'' تو وہ سرخ ہو جاتے' کبھی کبھی جوتا اتارنے کا اشارہ دیتے۔

.....•.....•.....•.....

وقت بہت آگے نکل آیا تھا۔ شیکھر بابو اب اکثر بیمار ہی رہتے تھے۔ رات رات بھر کھانستے رہتے اور لاجو دیدی بے چاری کانپتی سردیوں میں کبھی سر' کبھی پیر دبایا کرتیں۔ سائیکل والا کانا انکل اب دو دن بعد پاپڑ اور نمکینی روٹیاں لینے آیا کرتا تھا۔ لاجو دیدی نے گھر کے باہر چارپائی ڈال کر ٹافی اور سپاریاں بھی بیچنا شروع کر دی تھیں۔ گھر کا سارا بوجھ اب انہی کے کاندھوں پر تھا۔ ساس کی زبان کو اب بھی آرام نہیں تھا بلکہ شوہر کے مرنے کے بعد کچھ اور کھل گئی تھی۔

''حرام زادی' کھا گئی میرے رام لکھن کو..... یہ چوڑی چھاتی تھی' چڑیا کی پسلی رہ گئی۔ رام..... رام..... کوکھ جلی' ایک بچہ تو جن نہ پائی' خود سے میرا جنا بھی لے مری بے غیرت' رانڈ' چھنال۔''

مجھے حیرت ہوتی۔ ''اللہ! اللہ! اب تو بولیں لاجو دیدی' اب نہ بولیں تو کب بولیں گی بھلا؟ عمر کٹ گئی گالیاں کو سنتے سنتے' تم تو پال گئیں پورے گھر کو' بھلا ہم نہ جانیں شیکھر انکل کی معمولی تنخواہ تو بہنوں کے اللے تللے اور اپنے پان دارو میں اٹھ جایا کرتی

تھیں' پاپڑ بیل بیل تم نے دو نندیں بیاہیں' سب دن تہوار' سب تمہارے دم سے ہی تھے' پر تم رہیں سدا کی ڈھیٹ..... بے غیرت..... میرا دوست کہتا ہے' غیرت مند آدمی بولتا ہے۔'' میں گھنٹوں خود ہی خود میں الجھتا رہتا پاگل' بھلا میرے اس طرح الجھنے سے کیا لاجو دیدی کی زندگی کا الجھا ریشم سلجھ پائے گا۔

•.....•.....•

وہ دسمبر ہی کی کوئی شام تھی جب لاجو دیدی کی ساس ننگے پیر بھاگی چلی آئی تھیں ہمارے یہاں۔

''اے بہن فاطمہ.....! ذرا چل کے دیکھیو' لاجو..... دہری ہوئی پڑی ہے رات سے۔''

میری ماں ناک بھوں چڑھاتی اُس کے پیچھے ہولی تھی اور ماں کے پیچھے میں بھی۔ لاجو دیدی سرخ فرش پر بچھی رلی پر چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھیں۔

''یہاں درد اٹھا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ رات سے جی متلاتا ہے' تین بار الٹیاں کر چکی۔'' لاجو دیدی کی ساس بہو کے پیٹ کے داہنے طرف ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھیں۔ ''کیوں' میں جو سوچوں..... ٹھیک ہے ناں؟''

لاجو دیدی کی ساس کسی خوش فہمی میں تھیں۔ میں نے سنا' امی اسے ڈانٹ رہی تھیں۔

''کیا سوچو تم؟ دکھایا کسی ڈاکٹر کو؟ آج تک دو آنے کی دوا تم لائی نہیں بہو کے لیے؟''

''آئے..... دوا کیا لاتی' موئی کبھی راضی نہ ہوئی آنے جانے کو' کہیں' تم پھکر نہ کرو' بھگوان کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ میری پرارتھنا کا پھل بس ملا ہی ملا۔ کل ہی لے چلوں میں اس کو ڈاکٹرنی کے۔ بس بہت ہو چکے ٹونے ٹوٹکے۔''

اگلی صبح کالج جاتے میں نے پھر دیکھا' لاجو دیدی کے ہاتھ میں بڑا سا جھاڑو' شڑاپ شڑاپ دہلیز دھو رہی ہیں۔ میں رک گیا۔

''کیا ہوا لاجو دیدی؟ اب کیسی ہو؟''

''کرم ہے مالک کا۔ کالج جاتے ہو؟''

''ہاں۔''

''جاؤ' دیری نہ کرو' جاؤ شاباش۔'' اور دوبارہ شڑاپ شڑاپ گلی میں مڑتے میں نے پیچھے دیکھا تو گلی میں چارپائی پہ شیکھر انکل کا ڈھانچہ جسم موجود تھا جس پر لمبی چادر تان کے لاجو دیدی ان کا گوموت صاف کرتی تھیں۔ مجھے پہلی بار ان سے کراہیت محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں لاجو دیدی جیسی بے غیرت عورت واقعی نہیں دیکھی۔ کون سا تمہارے بعد مورتی بنا کر پوجا ہوگی' کون یاد کرتا ہے' آج مرے' کل دوسرا دن..... ہونہہ..... اس دن کالج کے بعد سائنسی آلات کی نمائش میں گیا' ذرا دیر ہوگئی۔ واپسی شام سانولی ہو رہی تھی۔

لاجو دیدی کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا' جھلنگا چارپائی پر شیکھر انکل کا ڈھانچہ کانپتا تھا اور لوہے کی ٹوٹی ٹانگ والی کرسی پر لاجو دیدی کی ساس ناک سڑکتی تھی اور لاجو دیدی جیسے سر جھکائے اقرارِ جرم کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''میں کیا کروں ماں جی! مجھے تمہارے بیٹے سے عشق ہوگیا تھا' میں بھی بچہ چاہتی تھی' بھلا میں عورت نہیں تھی کیا؟ مگر میں کہاں سے لاتی بچہ؟ تمہارا بیٹا تو بس خالی ڈھول ہے' اسی لیے تو سگائی سے ڈرتا تھا۔''

میرا وجود دھماکوں کی زد پہ تھا۔ لاجو دیدی تو وہ قطعہ زمین تھیں جو ہمیشہ تشنگی کا عذاب سہتا رہا جس پر ایک قطرہ بھی بادل نہ ٹپکا تھا۔ وہ تو اب تک کنواری تھیں۔ الٹا الزام سر لے لیا۔ ہائے لاجو دیدی..... ہائے..... بے چاری' اسی لیے تو بھی دوا آنے کی دوا لینے نہ گئی ڈاکٹرنی کے اور چپ چپیتے بے اولادی کے طعنے..... یہ کیا عشق تھا' یہ کیسی قربانی تھی؟ میرے قدم جم سے گئے تھے۔

''لاجو..... اے لاجو رانی.....'' پہلی بار لاجو کی ساس کی ایسی آواز نے ہمارے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ لاجو دیدی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا' لاجو کی آنکھ میں آج بھی آنسو نہیں تھے۔ میں نے ساری زندگی میں لاجو دیدی جیسی ''باغیرت'' عورت کبھی نہیں دیکھی۔

☆☆☆